بیسویں صدی کے اردو ناول میں پاکستانیت

منیب الحسن رضا*

(۱)

پاکستانی اُردو ناولوں کا تاریخی مطالعہ

پاکستان کی تشکیل کے ساتھ ہی علمی اور فکری سطح پر پاکستانی ادب جیسا تجربہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہم ناول اور افسانے کا مطالعہ پاکستانی ناول اور افسانے کے تناظر میں کرتے ہیں۔ اس دَور کے لکھنے والوں نے اس بدلتے ہوئے رجحان کو سیاسی، سماجی اور علمی سطح پر محسوس کیا ہے۔ ہم یہاں پر اس کا جائزہ ناول کے ذریعے لیں گے۔ ہمیں یہاں یہ دیکھنا ہوگا کہ آزادی کے بعد اُردو ناول کن دو صورتوں میں سامنے آیا اور بالخصوص پاکستانی اُردو ناول کس طرح عصری موضوعات سے جڑ کر اپنے دامن کو وسیع کرنے میں کامیاب ہوا۔ نیز حقیقت نگاری کے پہلو بہ پہلو مختلف طرح کے تجربات نے پاکستان اردو ناول کو کن نئی جہات سے روشناس کرایا؟

ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں کہ:

> ناول کا بنیادی فریضہ اپنے عصر کے سماجی حالات اور مسائل کی پیش کش ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد، مرزا رسواؔ اور پریم چند کے بعد ترقّی پسند تحریک کے زیرِ اثر سجاد ظہیر، کرشن چندر، عزیز احمد اور عصمت چغتائی وغیرہ نے اُردو ناول میں حقیقت نگاری کے پہلو بہ پہلو مختلف طرح کے تجربے بھی کیے اور اُردو ناول کو نئی جہات سے روشناس کرایا۔[۱]

پاکستان بننے کے بعد اُردو ناول کا کینوس وسیع ہوتا گیا اور اَب اس میں عصری موضوعات کے ساتھ ساتھ جدوجہد آزادی، شہروں کی سماجی صورتِ حال، آزادی کے وقت ہونے والی لوٹ مار، فسادات، سماجی زندگی کا بدلتا تار و پود اور کئی اہم انسانی المیے جگہ بناتے نظر آتے ہیں۔ برصغیر میں آزادی کی تحریک کے نتائج نے ناولوں پر کئی پہلوؤں سے اپنے اثرات مرتب کیے اور اسی لیے ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں کہ:

> برِّصغیر میں تحریکِ آزادی ایک اتنی بڑی تحریک تھی کہ اس کا فکشن میں ظہور کرنا ایک لازمی امر تھا۔ جہاں تک ناولوں کا تعلق ہے تو ان میں تحریک کے نتائج کے مختلف پہلو سامنے آئے۔[۲]

---

*ریسرچ اسکالر، جامعہ کراچی، واٹس ایپ نمبر: ۰۳۳۴۳۷۶۹۲۵۹

آزادی کے بعد پاکستانی اُردو ناول میں جو نام سب سے نمایاں ہیں۔ ان میں قرۃ العین حیدر، عزیز احمد اور شوکت صدیقی ہیں۔ انھوں نے آزادی سے قبل ہی ناول نگار کے طور پر اپنی شناخت مستحکم کر لی تھی جب کہ دیگر اہم ناول نگار بھی اس فہرست کا حصّہ بنیں گے جن میں جمیلہ ہاشمی، عبداللہ حُسین، ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب قابلِ ذکر ہیں۔

پاکستانی اُردو ناولوں کا ابتدائی دَور ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء

ادب میں عصری تاریخ کو پیش کرنا ایک ادیب کی سماجی ذمہ داری ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل جدوجہد آزادی، انگریزوں کے ظلم و ستم اور مقامی آبادیوں کے مسائل کو اُردو ناول میں موٴثر طریقے سے پیش کیا گیا۔ پاکستانی اُردو ناول نگاروں کے لیے یہ ایک روایت سی بن گئی کہ وہ تقسیمِ ہند کے سانحے کو بھی اپنے ناول کا حصّہ بنائیں کیوں کہ یہ ان کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کا موضوع تھا۔

قرۃ العین حیدر آزادی سے پہلے افسانہ نگار کے طور پر اپنی شناخت مستحکم کر چکی تھیں لیکن آزادی کے بعد ان کی پاکستان آمد اور اُردو کے عظیم ناول آگ کا دریا کو بھی آزادی کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ میرے بھی صنم خانے قرۃ العین حیدر کا ایک ایسا ناول ہے جس میں تقسیمِ ہند کے المیے کو ایک خاندان کی زبانی پیش کیا ہے۔ غفران منزل کا پیچو گھر کا سربراہ ہونے کے باوجود اپنی سمت سے عاری نظر آتا ہے۔

میرے بھی صنم خانے دراصل ایسا ناول ہے جس میں موجود ہر کردار بے سمت ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں موجود ہر کردار کے اپنے اپنے صنم خانے ہیں۔ گھر کا سربراہ طمانیت قلب کی دولت سے محروم ہے، اسی لیے یہ ناول ایک المیے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد غیاث الدین لکھتے ہیں کہ:

> میرے بھی صنم خانے میں ہر کردار کے اپنے اپنے صنم خانے ہیں۔ جس میں کسی کو بھی سکون حاصل نہیں ہے۔ زندگی کی بڑی سہولتیں انھیں میسر ہیں۔ مگر قلبی اطمینان سے محروم ہیں۔ پیچو جو غفران منزل کا روشن چراغ ہے۔ گاڑی، امتحان اور اعلیٰ نوکری کے باوجود بھی روحانی طمانیت سے دُور ہے۔[۳]

۱۹۴۸ـ۴۹ء میں شائع ہونے والا قرۃ العین حیدر کا یہ ناول، ناول نگاری میں ایک نئی تکنیک کا بانی بھی ہے کیوں کہ سجاد ظہیر کے ناول لندن کی ایک رات کے بعد اس ناول میں بھی ”شعور کی رو“ کا استعمال کیا گیا۔ تمام کرداروں کو زمانی ترتیب کے ذریعے اس طرح جوڑا گیا کہ ایک طرف سرحدوں پر لاکھوں لوگوں کی نقلِ مکانی جاری تھی تو دوسری طرف ان انسانوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مال واسباب کی بندر بانٹ

میں لگے ہوئے تھے اور شاید اسی لیے کرشن چندر نے اس ناول کو ایک ڈرائنگ روم ٹریجڈی قرار دیا لیکن قرۃ العین حیدر کے تخلیقی سفر میں یہ ناول ایک ایسے پڑاؤ کی سی حیثیت رکھتا ہے کہ جس نے انھیں آگ کا دریا لکھنے پر مجبور کیا۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر لکھنؤ کے جس جاگیر دارانہ سماج کی پروردہ تھیں اس کا اثر اُن کی تخلیقات میں نمایاں ہے۔ یہ ان کی ہمہ جہت شخصیت کا خاصہ ہے کہ انھوں نے میرے بھی صنم خانے نامی ناول کو اپنے وسیع تجربے کا عکاس بناتے ہوئے ہندوستان کو ایک صنم خانے سے تشبیہ دی ہے اور ایک پوری تہذیب کے عروج و زوال کو موضوع بنایا ہے۔ گویا یہ ایک ایسا صنم خانہ ہے جو اپنے ہی صنم گر کے خلاف بغاوت پر اتر آیا ہو۔ اس ناول کے سرورق پر علامہ اقبال کی ایک رباعی کے الفاظ اور میر انیس کا مذکورہ شعر برِّصغیر پاک و ہند کی تہذیبی ثقافت کی مکمل ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔ تراشیدم، پرستیدم، شکستم اور میر انیس کا شعر:

انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے[۴]

میرے بھی صنم خانے میں فرقہ واریت اور سیاسی صورت حال کو پس منظر کا حصّہ بناتے ہوئے اُردو ناول کی روایت سے جوڑا گیا ہے جس نے اس ناول کے سب سے اہم پہلو یعنی متوسط طبقے کی عکاسی کی ہے جو ابھی تک دم توڑتی روایت کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا اور اس میں اب تک شان دار ماضی کی گم گشتہ روایات موجود تھیں:

> احسان فراموش نئی نسل جاگیر دارانہ نظام کے خلاف نعرے لگاتی ہے اور تجویزیں پاس کرتی ہے۔ کنور صاحب خاموشی سے یہ سب دیکھتے ہیں اور قانون شیخ مولانا روم کا مطالعہ کرتے ہوئے شام کو معزز انڈین سول افسران کے ساتھ شطرنج کھیلنے کلب چلے جاتے ہیں وہ ایک پر سکون نظام زندگی کا بے ضرر سا پرزہ تھے۔ ان کی ذات سے نقصان کسی کو نہ تھا۔ فائدہ ہزاروں کو تھا مگر ان کو متوسط طبقے سے چڑ تھی۔ وہ اس خود غرض کاروباری دنیا میں سب سے الگ تھلگ صرف اپنے طبقے کے مٹھی بھر افراد کے ساتھ پرانی تہذیب اور روایت کے ورثے کو لیے بیٹھے تھے۔[۵]

قرۃ العین حیدر نے میرے بھی صنم خانے میں اپنی راہ متعین کر لی تھی۔ لہٰذا آگ کا دریا، سفینۂ غمِ دل اور کارِ جہاں دراز ہے جیسے ناولوں میں آزادی سے جڑے تمام تصوّرات و علامات کا ذکر انھیں پاکستانی اُردو ناولوں کا ایک اہم نام بناتا ہے۔

عزیز احمد تقسیم سے قبل ناول نگار، تنقید نگار اور ایک ادبی نظریہ ساز کے طور پر اپنی شناخت مستحکم کر چکے تھے اور ان کے مشہور ناول جن میں گریز، آگ، مرمر اور خون شامل ہیں۔ آزادی سے پہلے کے مروجہ تصوّرات کو بیان کرتے نظر آتے ہیں مگر آزادی کے بعد ان کا شائع کردہ ناول ایسی بلندی ایسی پستی تہذیبی رچاؤ، مکالموں اور نئی مملکت کے شہری سماج سے گندھا ہوا ایک ایسا سماجی منظر نامہ ہے جس کی پیروی ان کے بعد کئی ناول نگاروں نے کی جن میں شوکت صدیقی اور عبداللہ حُسین نمایاں ہیں۔

عزیز احمد مغربی ناول نگاری کی روایتوں سے آگاہ ہونے کے سبب خود کلامی، شعور کی رو اور کرداری ناول کو برتنے کا ہنر جانتے تھے۔ جنگِ عظیم دوم کے پس منظر سے جڑا ایسی بلندی ایسی پستی نامی ناول دکن کی تہذیب کے زوال کا المیہ ہے۔ عزیز احمد نے اس ناول میں مکالمہ نگاری کو موثر طریقے سے استعمال کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے جملوں کے سہارے قاری کو ایک ایسی بنیاد فراہم کی ہے جس کی روشنی میں وہ نئی مملکت کے قیام کا جائزہ بھی لے سکتا ہے اور دوسری طرف ایک ایسے متوسط طبقے کا عروج بھی دیکھ سکتا ہے جو جاگیرداری نظام کے زوال کی بنیاد بھی بنا۔ اس نے انگریز کے نظام کو یکسر مسترد کرتے ہوئے ایک نئے قائم کردہ ملک میں جانا بہتر سمجھا۔ اس ناول کا یہ اقتباس جنگ عظیم کے حالات اور اثرات سمیت ہندوستانی پاکستانی سماج کا عکاس ہے:

> فرنٹیئر میل بہت دیر سے پہنچی۔ جنگ اب ۱۹۴۵ء کی منزل میں تھی، دم توڑ چکی تھی۔ جرمنی کی ہار ہو چکی تھی، جاپان کی شکست باقی تھی اور امریکن سپاہی اور افسر ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے۔ ویک اینڈ پر آئی لڑکیاں اپنے یونیفارموں میں ٹہل رہی تھیں۔ ایک ایک ڈبے میں خواہ فرسٹ ہو، سیکنڈ ہو یا تھرڈ مسافر چھت تک ٹھنسے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے رشیدہ اور فاطمہ کو راولپنڈی سے دہلی تک ایئر کنڈیشنڈ کوپے ملا تھا۔[۶]

عزیز احمد کے ناولوں کے بارے میں یہ کہا جاتا رہا ہے کہ ان میں جنس کا بیان بھرپور شدت کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے لیکن یہاں یہ ذکر کر دینا بھی اہم ہے کہ ترقّی پسند تحریک نے جس طرح جنس کو ایک اہم تلازمہ اور زندگی کی ایک مکروہ حقیقت کے طور پر برتا تھا۔ عزیز احمد اس لحاظ سے جنس کے بیان کے قائل نہیں۔ ان کے تمام ناولوں میں جنس کا ذکر ایک مکروہ حقیقت کے طور پر موجود ہے یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ناولوں میں جس مٹتے ہوئے ہندوستانی سماج کی عکاسی ہے۔ اس سماج کی بربادی کی وجہ وہ جنس سے حد درجہ تعلق کو بھی سمجھتے رہے اور اسی لیے آگ یا ایسی بلندی ایسی پستی میں جنس کا بیان کراہت کے بجائے اسے زندگی کی ایک حقیقت بنا دیتا ہے۔ اس ناول میں ہندوستان کا جدید سماج اور بدلتے تصورات بھی موجود ہیں۔

یہ ناول فرقہ واریت کے تصوّر پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ اس موضوع پر اعلیٰ سوسائٹی کے چند دوست تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ فکر و فن کے لحاظ سے یہ ایک کامیاب ناول ہے جسے قاری بار بار پڑھ پڑھ کر بھی بیزار نہیں ہو سکتا۔ یہ عزیز احمد کے اسلوب کی دل کشی اور چاشنی ہے کہ ان کی تحریروں میں اپنے ناولوں کو کئی بار پڑھوانے کی طاقت ہوتی ہے۔ یہ طاقت ان کا اسلوب ہے۔ وہ لوکیشن کو اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے اس پورے منظر پر کوئی تیز روشنی ڈال رہا ہو۔[۷]

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ عزیز احمد ایک تخلیقی و تنقیدی ذہن رکھنے کے سبب آزادی کے اثرات سے آگاہ تھے لٰہذا ایسی بلندی ایسی پستی میں انھوں نے زوال پذیر جاگیرداروں کی آنکھ سے آزادی اور دو نئی مملکتوں کے نظام کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ اس ناول میں ایک طرف تو نیچرل ازم اور لبرل ازم کی ہلکی سی جھلکیاں موجود ہیں کیوں کہ اس نظام میں مرد و عورت، سب ہی آزادانہ جنسی تعلقات کے پروردہ تھے اور دوسری طرف انھیں اپنے مستقل کے بارے میں خطرات نے بھی پریشان کر رکھا تھا۔ لٰہذا وہ متوسط طبقے سے بھی گھبرا رہے تھے اور ستم بالائے ستم یہ کہ، اپنی عادات سے دست بردار ہونے کو بھی تیار نہ تھے۔ اسی لیے پروفیسر حسن عسکری نے اس ناول کو ایک عظیم تخلیقی تجربہ قرار دیتے ہوئے لکھا کہ :

> ایسی بلندی ایسی پستی صرف چند افراد کی داستان نہیں بلکہ ساتھ ساتھ ایک طبقے کی کہانی بھی ہے۔ غالباً یہ اُردو میں پہلا اجتماعی ناول ہے اور اُردو میں نیا تجربہ ہے۔ حیدر آباد دکن کے امیر طبقے کی تصویر اس سے پہلے کبھی اتنی کامیابی سے پیش نہیں کی گئی۔[۸]

عزیز احمد کی پیروی کرتے ہوئے پاکستانی اُردو ناول میں اجتماعی طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے کئی تجربے کیے۔ عزیز احمد کو پاکستانی اُردو ناول کے لیے رجحان ساز اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے جو محض ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کی بنیاد پر عصری اُردو ناول میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

پاکستانی اُردو ناول نگاری کا پہلا دور کئی ایک حوالے سے ناول کی تاریخ میں اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ پاکستان میں آنے والے ادیب آزادی کی قیمت دیتے اپنے ہم وطنوں کو دیکھتے آ رہے تھے۔ لٰہذا ان کے پاس اپنی ایک اہم بنیاد تھی۔ پھر انھوں نے ایک تہذیب کا زوال اور ایک تہذیب کا آغاز دیکھا تھا۔ لٰہذا ان کا تخلیقی تجربہ ان کے کئی تجربات سمیت فکشن کی اہم اصناف میں نظر آتا ہے۔

شوکت صدیقی بھی ایسے ہی ایک پاکستانی ادیب ہیں جن کا نام شہری سماج کی عکاسی کرنے والوں میں نمایاں ہے۔ ان کا ناول خدا کی بستی اجتماعی بیانیے، شہری سماج، نئی اقدار اور جرائم کی دنیا کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ان کے

ناولوں میں شہری سماج کا تہذیبی برتاؤ کئی رُخ لیے ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان کا ایک اور ناول جانگلوس دیہی سماج کی کریہہ صورت ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

> شوکت صدیقی نے جاگیردارانہ سماج کی ان خامیوں کو بے نقاب کیا ہے جس کی بنا پر
> جانگلوس اور خدا کی بستی پاکستانی اُردو ناول کے سرخیل قرار دیے جاسکتے ہیں۔[۹]

شوکت صدیقی کا شمار پاکستان کے ایسے ناول نگاروں میں کیا جاتا ہے جنھوں نے ترقّی پسند تحریک سے اثر قبول کرتے ہوئے سماجی حقیقت نگاری کی راہ اپنائی اور معاشرے کی ناہمواریوں کو اُردو ناول کا حصّہ بنایا۔ اُردو ناول میں شہری زندگی کی پیش کش کا جو مظہر شوکت صدیقی کے ہاں موجود ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے کیوں کہ خدا کی بستی میں شوکت صدیقی نے جس طرح ایک چھوٹی سی بستی کو کراچی سے جوڑ کر دکھایا ہے اسے کراچی کے بارے میں لکھے جانے والے ناولوں کا نقطہ آغاز بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

شوکت صدیقی کی تحریر انسانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑتی اور جگاتی ہے۔ شوکت صدیقی خود ان کریہہ المنظر لوگوں کو ہمدردی کی نظر سے ہی نہیں دیکھتے ہیں بلکہ ان رونما ہونے والے واقعات کے ذریعے ظلم، سماجی ناانصافی، جرائم اور طبقاتی نظام سے نفرت کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ واقعات کے اس بہاؤ ہی میں خدا کی بستی کی مقبولیت اور دلچسپی کا راز پوشیدہ ہے۔ خدا کی بستی میں واقعات کے دروبست کا جہاں تک تعلق ہے، ان کی ایک زنجیر سی بنتی چلی جاتی ہے جو کراچی شہر اور اس کے سماج کو آئینہ کر دیتے ہیں۔[۱۰]

شوکت صدیقی کے ناول دراصل پاکستانی سماج کے ان مہاجرین کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں جنھوں نے تقسیم کے سانحے کو اپنے ساتھ زیادتی سمجھتے ہوئے مملکت کے اجتماعی مفاد سے منھ موڑ لیا اور محض اپنا گھر آباد کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔

پاکستانی اُردو ناول کا یہ ابتدائی دَور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس دور کے ناول نگاروں نے آزادی کو بنیاد بناتے ہوئے اس کی جزئیات متعین کیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ دیگر ادوار کے اہم ناول نگار انھی روایات سے جڑ کر کسی نہ کسی طرح سماجی منظر نامے کی پیش کش کو اپنی تخلیقات کا حصہ بناتے رہے۔

(۲)

آزادی کے بعد کیوں کہ ہجرت ہی فکشن کا ایک مستقل موضوع رہا۔ لہٰذا پاکستانی اُردو ناول بھی اس کے اثرات سے باہر نہیں نکل سکے اور کئی دیگر اہم موضوعات کو بھی اس سے جوڑ کر دیکھا جانے لگا۔ گویا اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل نے ناول نگاروں کو ایک وسیع اظہاریہ فراہم کر دیا تھا جس نے ان

کے فکشن کو ہمہ گیر اثرات قبول کرنے پر مجبور کیا۔ خدیجہ مستور بھی پاکستانی اُردو ناول نگاری کے ایک ایسے ہی نام کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں جنھیں ان کے ناول آنگن کے ذریعے شہرت حاصل ہوئی۔ اس ناول کا تسلسل ان کے دوسرے ناول زمین کی صورت میں سامنے آیا لیکن اسے آنگن جیسی پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ برِّصغیر کا پورا معاشرہ آنگن کا موضوع ہے۔ اس میں موجود سیاسی کش مکش، انگریز دشمنی، مہاجرین کی آبادکاری اور شہری زندگی کی پیش کش نے اسے پاکستانی اُردو ناول کا نمائندہ بنا دیا ہے۔ اس ناول کے بارے میں شہاب ظفر اعظمی لکھتے ہیں کہ:

> خدیجہ مستور کا ناول آنگن وہ مشہور ناول ہے جس میں ایک متوسط مسلم خاندان کی معاشرتی زندگی اور اس کے بنیادی مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گھر کی چار دیواری میں محدود یہ آنگن برِّصغیر کے ہر گھر کا آنگن بن گیا ہے جہاں گھریلو مسائل بھی ہیں اور گھر سے باہر کے مسائل کی آہٹیں اور ان کے اثرات اور نتائج بھی۔"[1]

آنگن میں تقسیم سے پہلے کا منظر نامہ بھی موجود ہے لہٰذا اس ناول کو اس کی وسعت کی بنا پر زیادہ اہمیت حاصل ہے اور در حقیقت یہی ناول خدیجہ مستور کی پہچان بھی ہے کیوں کہ اس کے بعد منظر عام پر آنے والا ان کا ناول زمین ان توقعات پر پورا نہیں اتر سکا جو آنگن کی اشاعت کے بعد خدیجہ مستور سے وابستہ کر لی گئی تھیں۔ آنگن ایک ایسا ناول ہے جس کے تمام مرکزی کرداروں میں خواتین شامل ہیں جب کہ زمین میں عورت مرد کی سفاکی کا نشانہ بنتے ہوئے دکھائی گئی ہے۔ زمین ایک اہم تخلیقی تجربہ ضرور ہے کیوں کہ اس میں نئی مملکت کی بدلتی اقدار ملتی ہیں۔ اس ناول میں مہاجرین کے ساتھ ہوئے مظالم کی نشان دہی بھی موجود ہے۔

> زمین ایسے افراد کی کہانی ہے جنھوں نے آبائی زمین چھوڑ کر ایک نئی زمین پر اپنی دنیا بسائی اور یہ نئی بستی پاکستان اور اس کے مختلف شہر ہیں لیکن اس نئی زمین نے کبھی اپنے نئے باسیوں کو دل سے قبول نہیں کیا۔"[2]

خدیجہ مستور نے اپنے ناولوں میں جس طرح ماضی اور حال کو ایک ہی تہذیب کا حصّہ دکھایا ہے۔ اس کی بازگشت انتظار حُسین کے ہاں بستی، گہن اور آگے سمندر ہے کی صورت میں ملتی ہے اور بلاشبہ ان کا شمار اُردو کے عظیم ناول نگاروں میں کیا جاتا ہے کیوں کہ انھوں نے ہندو مسلم مشترکہ ثقافت کو ایک نئے بیانیے کی صورت میں پیش کیا ہے اور ان کے تقریباً تمام ہی ناول ماضی پرستی کی ایک ایسی آواز ہیں جن کی دھمک آج تک ہمیں اپنے کانوں میں سنائی دیتی ہے۔ انتظار حُسین ادبی حوالے سے قیامِ پاکستان سے پہلے اپنی شناخت مستحکم کر چکے تھے۔ لہٰذا ان کے یہاں تجربے

کی شدت کو پختگی حاصل ہے۔ انتظار حُسین نے محمد عمر میمن کو ایک انٹرویو میں یہ بتایا تھا کہ میں دار شکوہ کی شکست کو اپنی تہذیبی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ سمجھتا ہوں۔

انتظار حُسین کے ناولوں میں بستی کو عالم گیر شہرت حاصل ہے اور ''بستی'' پاکستانی ادب میں ایک ایسی مثال قائم کرتا ہے جس کی نظیر خود انتظار حُسین کے ناولوں ہی سے ملتی ہے۔ انتظار حُسین نے اس ناول میں جن بستیوں کو دکھایا ہے وہ نئی پرانی نسلوں، ماضی حال کے زمانوں اور جدید و قدیم فکر و عمل کے حامل کرداروں کا منظر نامہ ہے۔[۱۳]

انتظار حُسین نے بستی میں جن نئے افراد کو پاکستان میں آباد ہوتا دکھایا آگے سمندر ہے میں وہی کردار تقسیم سے پہلے کی آسائشوں کو یاد کرتے نظر آتے ہیں اور یہی ان کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ وہ اب تک نئی بستی کے رسم و رواج سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہو سکے۔

اس ناول کو کراچی کے حوالے سے یوں بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس ناول میں کراچی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے اور ہجرت کر کے آنے والے تمام کردار اس شہر میں ایک نئی شناخت کی لاحاصل جدوجہد سے جڑے نظر آتے ہیں۔ اس ناول کا عنوان ایک سیاسی بیان سے متاثر ہو کر لکھا گیا جو کچھ یوں تھا کہ سندھ سے آگے کراچی ہے اور کراچی سے آگے صرف سمندر ہے۔ اس سمندر میں ہر کوئی ایک دریا کی مانند ضم ہو گیا ہے مگر اپنی شناخت کو بھی برقرار رکھنا چاہتا ہے اور یہی اس ناول کا نقطہ اختتام بھی ہے۔

> میاں یہ شہر ست خصمی شہر ہے۔ سندھی، پنجابی، بلوچ، پٹھان، مہاجر، یاروں نے یہ شہر بسایا ہے یا کھچڑی پکائی ہے۔ رُکے پھر بولے اور مہاجر کی کوئی ایک قسم تھوڑی ہے۔ کوئی پورب کا، کوئی پچھم کا، کوئی اتر سے آیا، کوئی دکن سے چلا، سارے ہندوستان سے ندیاں بہتی شور کرتی آئیں اور سمندر میں آ کر مل گئیں مگر ہر ندی کہتی ہے۔ میں سمندر ہوں۔[۱۴]

اُردو ناول کا یہ دور پاکستان میں سیاسی اعتبار سے ہنگامہ خیز ثابت ہوا کیوں کہ اقتدار کی رسا کشی اور ملک دولخت ہونے کے صدمے نے تخلیق کاروں کو بھی متاثر کیا اور فکشن میں افسانے ناول اور ڈرامے کی سطح پر اس کا اظہار نظر آتا ہے۔ فضل احمد کریم فضلی اپنے ناول خونِ جگر ہونے تک میں قحطِ بنگال، بنگالیوں اور بہاریوں کی حالتِ زار، راشن کی کمی اور سیاسی صورت حال کا جائزہ پیش کر چکے تھے۔ اس ناول کو بنگلا دیش کے قیام سے پہلے پاکستانی اُردو ناول کا ایک نمایاں ناول کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس ناول میں پہلی بار مروجہ ناول نگاری کی تکنیک سے انحراف کرتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر ہیرو تراشا گیا ہے جو حالات کی ستم ظریفی اور تمام ترالمیوں سے گزرنے کے بعد بھی امید کا پیغام دیتا نظر آتا ہے۔ فضل احمد کریم فضلی نے اس ناول میں ہجرت کے مسائل کو بھی بے نقاب کیا ہے اسی لیے یہ ناول شہری

منظر نامے اور موضوعاتی پیش کش کے حساب سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس ناول کی تکنیک کے حوالے سے بھی کئی ایک تنقیدی مباحث ملتے ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں کہ:

> ہیرو جمع دار جلیل الدین جو ایک لحاظ سے غیر روایتی اور ادھیڑ عمر ہیں وہ اپنی دل چسپ حرکتوں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال سے پڑھنے والوں کو حد درجے محظوظ کرتے ہیں مگر فضلی صاحب کا کمال ہے کہ اس مزاح کے پیچھے زبردست سنجیدگی پنہاں نظر آتی ہے جو سوچنے پر مجبور کرتی ہے مزید یہ کہ ہمیں انسانی فطرت کے ان دیکھے رخوں کے شعور سے بہرہ ور بھی کرتی ہے۔ جمع دار جلیل الدین جہاں دیکھنے میں تھوڑے سے احمق، بے تکے اور مضحکہ خیز نظر آتے ہیں۔ وہاں وہ انتہائی متاثر کرنے والی ہستی بھی ہیں۔ ان کا کردار ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی زندگی دکھوں اور خوشیوں کا امتزاج ہوتی ہے جسے رو کر گزار دیا جائے یا ہنس کر۔ جمع دار جلیل الدین صاحب بیوی کے مر جانے، تمام ہستی لٹ جانے کے بعد بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں مگر پھر بھی ہمت نہیں ہارتے حالاں کہ کوئی پختہ ناول نگار آخر میں ان سے خودکشی کی واردات سرزد قرار دیتا لیکن فضلی صاحب نے ان کے ذریعے یہ معنویت پیدا کی ہے کہ ناقابلِ برداشت دُکھوں کو سہ جانا عظیم انسانوں کی روایت ہے۔[۱۵]

فضلی صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ اس ناول کے ہیرو جمع دار جلیل الدین سے غیر روایتی حرکات کرواتے ہیں مگر اس مزاح کے پیچھے بلا کی سنجیدگی موجود ہے جو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ انسانی فطرت کے شعور سے بہرہ ور کرتی ہے اور سنجیدگی و مزاح کا حسین امتزاج پیدا کر کے ناول کو زندگی کا آئینہ دار بنا دیا گیا ہے۔

پاکستانی اُردو ناول نگاری کا یہ دور سیاسی ابتری، مارشل لا اور فرد کی داخلی کش مکش کے حوالے سے تاریخ میں خاصا اہم ہے۔ اس دَور کی عکاسی جانگلوس، راکھ، نادار لوگ، میرا گاؤں، الکھ نگری، گھر میرا راستے غم کرے، دیوار کے پیچھے، تذکرہ، بستی، چاند گہن، خوشیوں کا باغ، جنم روپ، کاغذی گھاٹ، اللہ میگھ دے، مٹی آدم کھاتی ہے، خلیج، اِک کشتی ملاح سے خالی، چلتا مسافر، تنہا اور صدیوں کی زنجیر جیسے ناولوں کے ذریعے اس دور کی عکاسی ہوتی ہے۔

(۳)

پاکستان کی سیاسی تاریخ کو اگر واقعاتی تنوع کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کم و بیش ستر سالہ اس سفر میں چنیدہ واقعات ایسے ہیں جو اس پوری دہائی کا اجتماعی شعور بن کر سامنے آئے۔ پاکستانی اُردو ناول نگاری کا تیسرا دور بھی ملک میں جمہوریت اور آمریت کی کش مکش کی یاد دلاتا ہے کہ جب ایک منتخب وزیر اعظم کو ایک متنازعہ فیصلے کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے ملک میں علاقائیت، صوبائی تعصب کو ہوا دی گئی اور افغان جنگ کے نتیجے میں مہاجرین کے سیلاب کے سامنے بند باندھنے کی ہر کوشش ناکام بھی ہوئی جس کا خمیازہ کئی نسلوں کو بھگتنا پڑا۔

اس دور کا پہلا اہم ناول چیخ ایک ایسے جمود پرست معاشرے کی یاد دلاتا ہے کہ جس میں آزادی اظہار رائے کا مطلب جبری گم شدگی ہے۔ چیخ کو اسی لیے مارشل لا کے خلاف پہلی دستاویز کہا جاتا ہے کیوں کہ اس ناول کا مرکزی کردار گم نامی کے اندھیروں میں گم ہونے سے پہلے ایک معنی خیز چیخ کے ذریعے معاشرے کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار غلام، کافکا کے مشہور زمانہ ناول مقدمہ (Trial) کے اس مرکزی کردار کی یاد بھی دلاتا ہے جس کو ایک انوکھے مقدمے کا سامنا ہو اور فرد جرم عائد کرتے وقت بھی اسے جرم نہ بتایا جائے۔ غلام ایک اخبار میں معمولی ملازمت کرتا ہے مگر کتابیں پڑھنے کا جنون اسے ایک ایسی کال کوٹھری میں پہنچا دیتا ہے جہاں پاکستانی جیلوں کے تمام حربے اس پر استعمال کیے جاتے ہیں اور ایک ایسے انقلابی اخبار کا پتا پوچھا جاتا ہے جو گم شدہ ہے۔

ناول چیخ ۱۹۸۰ء میں لکھا گیا مگر آمریت کی صحافیانہ پابندیوں کے سبب ۱۹۸۷ء میں اس کی اشاعت ممکن ہو پائی۔ اس وقت کے پاکستانی معاشرے کی عکاسی اس ناول میں عمدہ طریقے سے کی گئی ہے۔ پاکستانی معاشرے کی بہتر عکاسی اس کے علاوہ بہت کم ناولوں میں نظر آتی ہے کیوں کہ پاکستان کا بد ترین آمرانہ دور اس ناول کے ہر صفحے اور لفظ پر ایک چیخ کے ذریعے اپنی پہچان کرواتا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد نواز لکھتے ہیں کہ:

> ضیاء الحق کا مارشل لا گزشتہ دو مارشل لاؤں سے اپنی ہیئت ترکیبی اور مزاج کے لحاظ سے مختلف تھا۔ ضیاء الحق ایک کٹر قسم کا مذہبی انسان تھا۔ اگرچہ اس میں یہ کٹر پن مذہب کے اسی پہلو کا تھا جو ہمارے سماج میں عمومی طور پر رائج ہے کہ عبادات اور شعائر کا بہت زیادہ پابند ہونا، مگر ان عبادات اور پیغام اسلام کی روح سے بہت دور ہونا۔ ضیاء الحق کے آتے ہی فوج کا اندرونی نظام پہلے سے زیادہ نیم مذہبی ہو چکا تھا۔[۱۶]

اس گیارہ سالہ آمریت کے سانحے کو برتنے میں اُردو ناول نگار فکشن کی دوسری اصناف کے مقابلے میں کسی طور بھی پیچھے نہیں رہے اور کئی ایک ایسے اہم ناول تخلیق ہوئے جو نہ صرف اس دور کا احاطہ کرتے ہیں بلکہ مستقبل کی ایک

تصویر بھی ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ مستنصر حُسین تارڑ کا ناول راکھ بھی اس دور کا ایسا ہی سماجی منظر نامہ ہے جو رات اور اندھیرے کی کوکھ سے جنم لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس ناول کے مرکزی کرداروں کے نزدیک زندگی میں انسان وقت کی کترن کے سہارے بہت کچھ حاصل کرنے پر قادر ہوتا ہے مگر اس ناول کا کینوس وسیع ہونے کے سبب اس میں کئی دیگر ضمنی مفاہیم و عنوانات بھی پائے جاتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار مشاہد ہے مگر اس ناول کے خمیر میں ایک مسالا گوندھا گیا ہے کہ ہر فرد اس ناول کا مرکزی کردار دکھائی دیتا ہے کیوں کہ کبھی مردان، فاطمہ، بابو راؤ پٹیل اور کبھی برگیتا یا آنٹی بابر کا گھر اس ناول کا موضوع بدلتے نظر آتے ہیں اور یہی مستنصر حُسین تارڑ کا مقصد بھی تھا کہ انھوں نے مشرقی پاکستان اور ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کو ہی پاکستان کی اس شناخت کا محافظ بتایا ہے جو راکھ ہوتی جارہی ہے۔

> راکھ میں مستنصر شاید درست سوچتے ہیں کہ ہمالیائی غلطیوں کے نتیجے میں انسانوں پر کتنے مہیب اور ہولناک ظلم ٹوٹتے ہیں لیکن ہمالیہ نہیں روتا۔ کیا یہ انسانی المیہ نہیں یا پھر وہی ہماری تقدیر ہے۔[۱۷]

پاکستانی فکشن کے ضمن میں مستنصر حُسین تارڑ کے کئی اور ناولوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے جن میں ڈاکیا اور جولاہا، قربت مرگ میں محبت اور خس و خاشاک زمانے قابل ذکر ہیں۔ پھر دنیا بھر میں اجاگر ہوتے مسئلے یعنی پانی کی کمی کے حوالے سے ایک پوری تہذیب کو مٹتا ہوا دکھانا بھی انھیں کا خاصہ ہے جسے انھوں نے اپنے ناول بہاؤ میں استعمال کیا۔

پاکستانی اُردو ناول کا یہ تیسرا دور اس حوالے سے بھی منفرد ہے کہ اس دور میں سیاسی اور سماجی ڈھانچا شکست و ریخت کے کئی مراحل سے گزرا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملک میں ایک طویل آمریت کی سیاہ رات کے بعد عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل حکومت برسرِ اقتدار آئی مگر یہ سب اتنا آسان نہ تھا۔

> اس دور میں پاکستانی سماج میں انسانی گروہی تعلقات کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا جائے تو عارضی مفادات پر تعلق واضح اور گہرے نظر آئیں گے۔ ممکنہ طور پر اس کی بنیادی وجہ ہمارے حکومتی اور ریاستی نظام میں پائی جانے والی وہ بے ثباتی تھی جس نے ہر شعبہ ہائے زندگی کو عارضی پن میں تبدیلی کر دیا تھا۔ ''ایڈہاک ازم'' اور ''ڈنگ ٹپاؤ'' منصوبہ بندیوں نے ریاستی نظام کے ساتھ ساتھ سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ اور دیگر معاملات میں ظاہری مفادات کو مد نظر رکھ کر شامل ہونے لگے۔ وہ سماجی اقدار جو ہمارے سماج میں کسی

> نہ کسی حد تک برقرار تھیں۔ جو کمزور ہوتے ہوتے ڈھ گئیں۔ نئی اقدار جنھیں بعض حوالوں سے اقدار کہنا بھی مشکل ہوگا یا شاید منفی اقدار کہا جاسکتا ہے روز بروز پوری شدت سے سماج کو اپنی لپیٹ میں لینے لگیں اور پورا معاشرہ تشنج کا شکار ہو گیا۔[۱۸]

پاکستان کی سیاسی سماجی اور مذہبی تاریخ کے المیے کو اس دور کا ناول نگار کس حد تک پیش کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کا اندازہ اس دور کے ناولوں کے غالب رجحانات سے لگایا جاسکتا ہے۔

پاکستانی اُردو ناولوں کا موضوعاتی مطالعہ

۱۵۳ سال پر محیط اُردو ناول نگاری کی تاریخ کا مطالعہ چند اہم حقائق کی جانب ہماری راہ نمائی کرتا ہے لیکن اس کم مدت میں بھی اس صنف ادب نے اپنا ایک اہم مقام بنالیا ہے۔ مولوی نذیر احمد سے لے کر جدید ناول نگاروں تک پہنچتے پہنچتے اُردو ناول نگاری نے موضوعاتی اور ہیئتی اعتبار سے کافی صورتیں بدلی ہیں۔ اس نے زمانے کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے حالات و واقعات کی تصویر کشی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ابتدا میں اگرچہ اُردو ناول کا دائرہ اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی اصلاح سے متعلق موضوعاتی حدبندیوں تک ہی محدود تھا لیکن آہستہ آہستہ اُردو ناول نے تمام بحرانی حالات کو اپنے اندر سمیٹنا شروع کیا۔ یہاں یہ بات ملحوظِ نظر رہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو ناول نگاروں نے سانحاتی صورت حال کو زیادہ موثر انداز میں پیش کیا کیوں کہ تقسیم ہند کے بعد اُردو ناول ایک نئے موڑ سے آشنا ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طویل جدوجہد کے بعد ہندوستان انگریزوں کے دستِ استحصالی سے آزاد ہوا۔ آزادی کا خواب جو ہندوستانی تقریباً ڈیڑھ سو سال سے دیکھ رہے تھے جب وہ تعبیر کی منزل تک پہنچا تو اس کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ چناں چہ قتل و غارت گری اور خون ریزی کا ایک بہت بڑا سیلاب آیا جس نے انسانی تہذیب و تمدن کا جنازہ نکال دیا۔ ایک بڑی تعداد میں دونوں ملکوں میں انسانوں کو بانٹا گیا یعنی آبادی کا تبادلہ ہوا۔ یہ ایسے انسانیت سوز واقعات تھے جنھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں اور فن کاروں کو بے حد متاثر کیا۔ انھوں نے اپنے فن پاروں میں آزادی، فسادات، ہجرت اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات و واقعات کو موضوع بنایا اور انسانی تہذیب کی شکست و ریخت کا المیہ پیش کیا۔ اُردو ناول نگاری بہت حد تک ۱۹۴۷ء کے بعد اور اس سے پہلے بھی ایسے ہی سانحاتی حالات کی عکاس رہی ہے۔

تاریخ اور سیاست کو ناول میں برتنے کا چلن نیا نہیں اور اسی لیے ان دونوں عوامل نے پاکستانی اُردو ناول پر بھی گہرے اثرات مرتسم کیے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت، فسادات اور ماضی پرستی کے ایک رجحان نے شدت کے ساتھ پاکستانی اُردو ناول میں جنم لیا۔ جس کے تحت آگ کا دریا، اداس نسلیں، آگے سمندر ہے، تذکرہ، بستی

اور راکھ جیسے ناول منظرِ عام پر آئے۔ ان ناولوں میں خصوصیت سے مہاجرین کے مسائل، بچھڑ جانے والوں کا قصہ، ہجرت کی تباہ کاریاں اور سیاسی رجحانات نظر آتے ہیں۔

> آزادی کے پہلے دس برسوں میں انفرادی و قومی آزادی کی شناخت ہی مسئلہ بن گئی۔ قومی شناخت اور اس سے وابستہ مسائل ہم کئی ناولوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا آگ کا دریا (۱۹۵۱ء)، سنگم (۱۹۶۰ء)، داراشکوہ (۱۹۶۷ء)، راجہ گدھ (۱۹۸۱ء) اور بہاؤ (۱۹۹۲ء) منظرِ عام پر آئے۔[١٩]

کرداروں کی نفسیاتی پیش کش اور ماضی پرستی کے ضمن میں پاکستانی اُردو ناول میں دو اہم تجربات کیے گئے اور بانو قدسیہ کا ناول راجہ گدھ جب کہ اکرام اللہ کا ناول گرگِ شب عمرانی نقطۂ نظر کے لحاظ سے ناول میں کامیاب تجربے ہیں۔ دونوں ناولوں میں جدید ترین طرزِ زندگی کے تقاضوں کو جنس کے پیرائے میں دیکھا گیا ہے اور معاشرے پر حرام کی کمائی کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان گرگِ شب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> اکرام اللہ کے ناول گرگِ شب (۱۹۷۸ء) میں موضوع یا تھیم کے اعتبار سے ایک تجربہ کیا گیا ہے جس کا تعلق اوڈی پس کمپلیکس (Oedipus Complex) جیسے نفسیاتی و جنسی رویے سے ہے بلکہ یوں کہیے کہ Incest سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں سے جنسی تعلق کہ جن سے کہ اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔[٢٠]

اُردو میں اس نوعیت کا تجربہ کرنے کی ہمت صرف بانو قدسیہ کر سکیں۔ جب انھوں نے راجہ گدھ میں لاہور کے شہری پس منظر کو کامیابی سے بیان کرتے ہوئے محبت کی ایک تکون کو گدھ کی تمثیل کے ذریعے بیان کیا اور آفتاب، سیمی، قیوم، عابدہ، امتل اور ڈاکٹر سہیل جیسے کردار تخلیق کیے۔ یہ ناول ایک مخصوص نفسیاتی فلسفے کی دلالت کرتا ہے۔ اس ناول کو ایک مخصوص مذہبی پیرائے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

راجہ گدھ کی مصنفہ کے مذہبی نظریے کی دلیل پیش کرتا ہے کہ رزق حرام، دیوانگی اور (Maladjustment) کا باعث بنتا ہے۔ ناول میں پروفیسر سہیل اس نظریے کا خالق ہے جو انسان کی غذا کو اس کے (Bene Mutation) میں تبدیلی کا باعث قرار دیتا ہے اور یہودیوں کی ذہانت اور شوخی کا سلسلہ من و سلویٰ کی غذا سے جوڑتا ہے۔ اسی وجہ سے قیوم جو زندگی بھر ناجائز جنسی تعلقات یا مذہب کی رو سے حرام کاری کا مرتکب رہا اپنی سوسائٹی اور حلقے میں کبھی ایڈجسٹ نہ ہو سکا۔[٢١]

پاکستانی اُردو ناول میں کئی ایسے موضوعات کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے جو اس سے پہلے کبھی اُردو ناول کا حصہ نہیں تھے۔ اکثر ناولوں میں ایسے موضوعات ضمنی حوالے سے بھی سامنے آتے ہیں لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ موضوعات جدید طرزِ زندگی کا پیش خیمہ ہیں اور ان میں جدید انسان اپنی تمام تر داخلی کش مکش کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ان ناولوں میں نگری نگری پھرا مسافر، چاندنی بیگم، ایوانِ غزل، معصومہ اور اللہ میگھ دے شامل ہیں کیوں کہ ان سب میں جنوبی ایشیا کے معاشرے میں عورت کی آزادی کے تصوّر کو موضوع بنایا گیا ہے مگر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے موضوعات راست مغربی ادب کے مطالعے سے اخذ کیے گئے ہیں لیکن بہ ہر حال پاکستانی اور بالخصوص اُردو ناول نگاری کے ضمن میں یہ تجربات اور اثرات خاصے اہمیت کے حامل ہیں۔

تجرباتی سطح پر پاکستانی اُردو ناولوں پر اس پورے دور میں اسلوب کے جو تجربے ہمیں نظر آتے ہیں۔ ان میں انیس ناگی کا ناول میں اور وہ، انور سجاد کا ناول خوشیوں کا باغ، انیس ناگی کا ہی ناول دیوار کے پیچھے اور فہیم اعظمی کا ناول جنم کنڈلی قابلِ ذکر ہیں۔ گو کہ اسلوب کی سطح پر تجربے کا رجحان زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا مگر اسے پاکستانی سیاسی حالات کا جبر اور دباؤ ہی کہا جانا چاہیے کہ علامتی افسانہ نگاری کی تکنیک کو ناول میں بھی برتنے کی کوشش کی گئی۔

ناول نگار مخصوص زمانی حالات کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا اور اسی لیے پاکستانی اُردو ناولوں میں بھی پاکستانی ثقافت کے تمام مظاہر نظر آتے ہیں۔ اس سماجی منظر نامے کی تشکیل و پیش کش کو بھی پاکستانی اردو ناول کا ایک اہم باب سمجھا جاتا ہے۔

پاکستانی اُردو ناول میں پاکستانی سماجی منظر نامے کی پیش کش

آزادی سے قبل شہری زندگی میں طرزِ بود و باش کا کوئی خاص تصوّر موجود نہ تھا۔ لہٰذا لوگوں کی محدود ضرورتوں اور نقل و حرکت کی کمی نے شہری طرزِ زندگی کے تصوّر کو پنپنے نہیں دیا۔ انگریز ہندوستان پر طویل عرصے حکمرانی کرنے کے خواہاں نہیں تھے بلکہ وہ کئی ایک مواقع پر اس بات کا اظہار کر چکے تھے کہ ہندوستان ان کے لیے ایک سونے کی کان سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا جو طرزِ زندگی نوآبادیاتی نظام نے ہندوستان میں تشکیل دیا اس کی جھلک آزادی کے بعد بھی کافی عرصے تک نمایاں رہی۔ تاوقت یہ کہ شہروں میں متوسط طبقہ وجود میں آیا اور اسی کے سہارے شہری اور سماجی منظر نامے کی تشکیل شروع ہوئی۔

متوسط طبقے کی تشکیل اس سماجی نظام کے تحت ہوئی جس نے پرانے سماجی منظر نامے کو بالکل بدل کر رکھ دیا اور اسی کی وجہ سے اب اس طبقے کو معاشرے کا انجن کہا جانے لگا جو محنت کے ذریعے اپنی زندگی بدل کر طبقہ اشرافیہ میں شامل ہونے کی خواہش رکھتا تھا۔ اس صورتِ حال میں شہروں کی طرف لوگوں کا ہجرت کرنا ایک فطری عمل تھا اور

اسی کے سہارے شہر بھی جدید ہونا شروع ہوئے جس نے صنعتی ترقّی کی راہ ہموار کی جس طرح قدیم انگلستان میں صنعتی ترقّی کا انجن ایک ایسے طبقے کو تشکیل دینے کا سبب بنا تھا جو روایت سے بھی وابستہ رہنا چاہتا تھا اور اس کے پاس نقل و حمل کے جدید ذرائع بھی موجود تھے اسی طرح آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں ایسا ہی ایک طبقہ ابھرتا ہوا نظر آتا ہے جس کی عکاسی فکشن اور نان فکشن کی سطح پر اُردو ادب میں کی گئی ہے۔

پاکستانی شہری منظر نامہ اور قرۃ العین حیدر کے دو ناول

ایک علمی و ادبی خانوادے سے تعلق رکھنے والی مصنفہ قرۃ العین حیدر کا شمار اُردو ادب کے ان اعلیٰ ترین اذہان میں کیا جا سکتا ہے جو برِّصغیر کی تاریخ، سماجیات، نفسیات اور ذات پات کے نظام پر گہری گرفت رکھتے تھے لہٰذا ہندوستان پاکستان کا سماجی ڈھانچا اور اس کے تمام مظاہر کا ذکر ان کے تمام ناولوں میں موجود ہے۔ آگ کا دریا ان کا ایک ایسا ہی ناول ہے جس کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور اس کے آخری ابواب میں نئی مملکت کی تشکیل اور شہروں کے بسائے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ گوتم نیلمبر اور چمپا کے کردار ناول کے شروع سے آخر تک موجود رہتے ہیں اور طبقاتی کشمکش کا ایک اہم موضوع ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ تقسیم کے بعد کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں: مسلمان متوسط طبقے نے اپنی ساری تاریخ میں آج تک اس قدر زبردست خوش حالی حاصل نہیں کی تھی۔ یہاں نئے دولت مند متوسط طبقے کی حکومت ہے۔ ان کا نیا سماج، ان کے نئے اصول، کراچی بے حد جدید شہر ہے۔ یہاں روز رات کو اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں اور کلبوں میں ایک جگمگاتی کائنات آباد ہوتی ہے۔ ماہرین عمرانیات کے لیے یہ مسئلہ نہایت دل چسپی کا باعث ہونا چاہیے کہ پچھلے نو سال میں کس طرح ایک نئے معاشرے نے اس ملک میں جنم لیا ہے۔ اس معاشرے کی بنیاد روپیہ ہے اور روپیہ بناؤ اور دولت حاصل کرو۔ آج بہتی گنگا میں ڈبکیاں لگا لو، کل جانے گنگا خشک ہو جائے یا اپنا رخ بدل لے۔ [۲۲]

پاکستان بننے کے بعد متوسط طبقے کی جو موثر منظر کشی قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نظر آتی ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس ریاست پر ابتدا سے ہی ایسے لوگوں کا قبضہ رہا جو تقسیم سے پہلے کچھ نہ تھے اور کئی سماجی ماہرین نے ان کے لیے نو دولتیوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آگ کا دریا میں ہی کئی دیگر مقامات پر قرۃ العین نے اس طبقے کی نشان دہی کی ہے۔ ذرا یہ اقتباس دیکھیے:

> پاکستان کے کیا حال ہیں؟ چا ابو بولتے رہے۔ سنا ہے یہاں سے دھنیے جولاہے جا کر وہاں لکھ پتی ہو گئے، اپنے کو سید کہویں ہیں اور کوٹھیوں میں رہے ہیں۔ [۲۳]

قرۃ العین حیدر نے جس طرح ہندوستان کی سماجی تاریخ کو اپنے ناول میں جگہ دی ہے۔ اس سے اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد بھی اسی سماجی تاریخ کا دھارا اپنی نئی شکل میں جاری و ساری ہے اور کم و بیش چند ایک مستثنیات کو چھوڑ کر سرحد کے اس طرف بھی یہی حال ہے لیکن سرکاری سطح پر جاگیر داری نظام ختم کرنے کی وجہ سے ہندوستان کا سماجی منظر نامہ آج ہم سے تھوڑا مختلف ہے۔

قرۃ العین حیدر کا ایک اور ایسا ناول جو ہندوستان، پاکستان سے چھپنے والے ان کے کسی مجموعے میں دستیاب نہیں۔ دراصل ایسا ناول ہے جو حقیقت میں پاکستان کے سماجی منظر نامے کی پہلی دستاویز ہے کیوں کہ اس ناول میں کراچی کے منظر نامے کا مکمل بیان ہے۔ یہ ناول نئی مملکت بننے کے بعد مہاجرین کے وہاں پر مسائل اور ان کی آمد پر مقامی باشندوں کے اعتراضات کا بھی جائزہ لیتا ہے۔ در حقیقت اس ناول میں پہلی بار پاکستان کا سماجی منظر نامہ پوری آب وتاب سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ ذرا یہ اقتباس دیکھیے:

> جمشید فرحت النساء کو محمد گنج سے اپنے ساتھ کراچی لے آیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس کے لیے ایک اینگلو انڈین گورنس مقرر کی اور اسے ایک اعلیٰ درجے کے پرائیویٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ عالیہ نے بھتیجی کی تعلیم و تربیت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اب وہ گھر پہ اور اسکول میں فیری کہلاتی تھی اور چند سال کے اندر اندر بڑی اسمارٹ اور تیز طرار Teen Ager بن چکی تھی جو تنگ موریوں کی شلوار، بغیر آستین کی نہایت چست قمیص پہنتی تھی اور دوپٹے کے بجائے ایک قسم کا پٹا کندھے پر لگائے رکھتی تھی اور راک این رول (Rock n Roll) کی ماہر تھی۔ اپنے نانا کے آنگن کو اس نے بھولے سے بھی یاد نہیں کیا۔[۲۴]

اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے کراچی کو ایک عظیم مہاجر گاہ میں تبدیل ہوتے ہوئے دکھایا ہے جہاں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ترک وطن کر کے آنے والے اکھٹے ہو رہے تھے اور مقامی باشندوں سمیت حکومتی اہل کاروں کو بھی خاصی مشکلات کا سامنا تھا۔ اس ناول کے ہر صفحے پر قرۃ العین حیدر نے ایک تہذیبی بحران کو جنم لیتا ہوا دکھایا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہجرت کر کے آنے والوں کی طرز بود و باش کس قدر مختلف تھی اور انھیں دوسرے ملک میں آکر کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ناول میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ پاکستان بننے سے پہلے جو لوگ ہندوستان میں بے وقعت تھے وہ پاکستان آتے ہی کس طرح یہاں کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔ جمشید متوسط طبقے کا ایک ایسا ہی کردار ہے جو اپنی پچھلی شناخت کو جان بوجھ کر پس پشت ڈالتا ہوا آگے بڑھنے لگا اور اس شہر میں تیزی سے

ترقّی کی منازل طے کر گیا بلکہ ایک وقت تو ایسا آیا کہ ہندوستان کے نوابین اور ان کی اولادوں کو بھی جمشید کا ملازم ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔

قرۃالعین حیدر کے مہاجر کرداروں کا اگر ہم مطالعہ کریں تو یہ بات سمجھ آتی ہے کہ تقریباً وہ تمام کردار جو پاکستان آ گئے وہ اپنے ذہن سے کبھی بھی ہندوستان میں اپنی شان و شوکت کو نہیں بھلا سکے اور انھیں فراموش شدہ یادوں نے انھیں اس نئی مملکت میں وہ سب کرنے پر مجبور کیا جن سے ان کی ماضی پرستی کا سیل رواں کچھ دیر کے لیے تھم سا گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی ناول میں کرداروں کے بطن سے کچھ نئے کرداروں نے جنم لیا جو خاص طور پر پاکستانی معاشرے کی پیداوار کہے جا سکتے ہیں۔ جمشید انھیں کرداروں کا سرخیل ہے اور اس کا خود اپنے بارے میں یہ ماننا ہے:

> چھوٹی بٹیا پرسوں رات میں نے بہت پوشیدہ ڈھانچے اپنی الماری میں سے نکالے، ان کو جھاڑا پونچھا اور انھیں الماری میں دوبارہ منتقل کر دیا۔ میں نے اپنی لاش کا خود پوسٹ مارٹم کیا اور اسے زندگی کے مردہ خانے میں برف کی سلوں تلے دبا دیا اور آج میں وہی جمشید سید ہوں جس سے آپ پچھلے چار مہینے میں واقف ہیں۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے میں ایک انتہائی ذلیل، بے رحم، خود غرض، کمینہ اور مفاد پرست انسان ہوں۔ میں ایک ایسا شخص ہوں جس کے لیے کسی قسم کی پرانی اقدار، شرافت، اصول پرستی وغیرہ وغیرہ کے تصوّرات لایعنی ہو چکے ہیں۔[۲۵]

سود و زیاں کی جس کش مکش میں پاکستانی معاشرے کے تمام افراد مبتلا ہو چکے تھے۔ جمشید ان کا محض عکس اول ہے اور اسے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی تھی کہ وہ خود ایک عظیم الشان دنیا کی اس چھوٹی سی بلیک مارکیٹ کا ایک حصّہ ہے جہاں جسم سمیت روحوں کے سودے بھی ہوتے ہیں اور وہ خود ان کی خرید و فروخت کا حصّہ بنتا ہے۔

قرۃالعین حیدر کے ناولوں میں جس نئی سوسائٹی کا نقطۂ عروج نظر آتا ہے اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے انتظار حُسین بھی صراحت سے پاکستانی سماج کے منظر نامے کو بالترتیب اپنے دو ناولوں، بستی اور آگے سمندر ہے میں پیش کرتے ہیں۔ ان ناولوں میں قیام پاکستان کے بعد لاہور اور کراچی شہر کی ابتدائی زندگی کا احوال موجود ہے۔

انتظار حُسین کا فن کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ ایک ایسے سماج کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ جس میں کہیں نہ کہیں ہمارا اپنا عکس بھی ہمیں نظر آتا ہے۔ ان کا اوّلین ناول چاند گہن قیام پاکستان کے فوراً بعد کی صورت حال ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور اس میں بالخصوص لاہور کی ابتدائی زندگی موجود ہے۔ اس ناول

کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پاکستان کا بھی ابتدائی نقشہ ہے کیوں کہ اس کے کردار ہجرت کے سانحے کو قبول نہ کر سکتے ہوئے ایک عجیب سی تلخی کا شکار نظر آئے اور ہمیشہ پاکستانی معاشرے میں اجنبی رہے۔

ناول کے آخر میں ایک گھٹن ،اُداسی اور Frustration کی کیفیت رہ جاتی ہے۔ تمام ہی کردار کٹی پھٹی اور ادھوری زندگیاں گزارتے ہیں کیوں کہ ان کی آنکھیں ماضی میں کھلتی ہیں۔ اسی لیے یہ سبھی زندگی کی بے معنویت، بے مقصدیت اور ذاتی تنہائی کا شکار ہیں۔ ان کا اصل مسئلہ ان کا احساس اور وضع داری ہے ورنہ بے حس و شاطر افراد کو بے نظم اور بے اصول معاشرہ خوب راس آتا ہے۔[۲۶]

انتظار حُسین کا نمائندہ ناول بستی کئی حوالوں سے اپنے اندر ایسے اوصاف رکھتا ہے جس کا تذکرہ اُردو کے عظیم ناولوں میں کیا جانا چاہیے۔ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء اور دسمبر ۱۹۷۱ء کے پس منظر میں لکھا جانے والا یہ ناول لوکیل کے اعتبار سے مقامی ہے مگر اس کی جڑیں سرحد پار تا بین الاقوامی سطح تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس ناول میں بھی مرکزی کردار ہجرت سے پہلے کے ہندوستان کو یاد کرتے ہیں مگر اس بار ان کا برتاؤ مختلف ہے۔ اس ناول میں پاکستانی انتظامیہ کے بے حس رویے سے زیادہ لوگوں سے کیے گئے ان کے وعدے بھی موجود ہیں جن کا تذکرہ پاکستانی مزاحمتی ادب کا جزو لاینفک ہے۔

انتظار حُسین کے فن کی یہی خاصیت ہے کہ اس میں کے ساتھ سفر کر کے قاری اپنی اصل شناخت تک پہنچ جاتا ہے۔ بستی میں بھی جا بجا ایسے مقامات آتے ہیں جہاں انتظار حُسین نے لاہور کا ذکر کرتے کرتے اچانک کہانی کو اسلوب کی مہارت سے جاتکوں (ہندی دیومالا سے لیا گیا لفظ)، حکایتوں اور روایات سے جوڑ دیا ہے۔ ذرا یہ منظر دیکھیے:

> مگر کمال ہے وہ اپنے آپ پر حیران ہونے لگا۔ باہر جتنا ہنگامہ بڑھتا جاتا ہے میں اپنے اندر سمٹتا جاتا ہوں۔ اندر کی یادیں باہر آ رہی ہیں۔ اگلے پچھلے قصّے، بھولی بسری یادیں، یہ باتیں ایک کے ساتھ دوسری، دوسری کے ساتھ تیسری، الجھی ہوئی جیسے آدمی جنگل میں چل رہا ہو۔ میری یہ یادیں میرا جنگل ہیں۔ آخر یہ جنگل کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ نہیں میں کہاں سے شروع ہوتا ہوں اور وہ پھر جنگل میں تھا۔ جیسے جنگل کی انتہا تک پہنچنا چاہتا ہو، جیسے اپنا شروع تلاش کر رہا ہو۔[۲۷]

ہجرت کو انتظار حُسین کے فن کا اگر بنیادی کلیہ مان لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انتظار حُسین نے ہجرت کو محض یادوں کی بازیافت سے نہیں جوڑا بلکہ اس کے نئے امکانات و اطلاق بھی ان کی تحاریر میں نظر آتے ہیں۔ ہجرت کے سانحے میں جو مسئلہ سب سے پہلے مہاجرین کو درپیش تھا وہ ہندوستان سے گھر بار چھوڑ آنے والوں کو نئی سرزمین کی تلاش کی صورت میں پیش آیا۔

ان کا نسبتاً غیر معروف ناول تذکرہ بھی ہجرت کے سانحے سے شروع ہوتا ہے۔۔ ہندوستان سے گھر بار چھوڑ آنے والے نئی سرزمین پر مستقل ٹھکانے کی تلاش میں تھے۔ اور ان کا یہ مسئلہ نئی ہاؤسنگ سوسائٹی/سوسائٹیز کے قیام نے حل کیا مگر کیا یہ سب کچھ ان کا من چاہا تھا؟ تذکرہ میں دو بار ہجرت کا ذکر ملتا ہے۔ مرکزی کردار اخلاق علی کے دادا کے لکھے گئے تذکرے سے شروع ہونے والا ناول پاکستان میں آشیانے سے ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے کیوں کہ یہ صرف اس ایک خاندان کا تذکرہ نہیں بلکہ لاکھوں لوگ ایسے تذکرے اور یادداشتیں سینے سے لگائے اس سرزمین پر چلے آئے تھے جو ان کی امیدوں کا آخری آشیانہ تھی مگر اس زمین کا احوال ملاحظہ کیجیے:

> ہر زمین ہر آدمی کو راس نہیں آتی۔ بعض زمینیں اکل کھری ہوتی ہیں کہ اپنے کسی باسی کو بستے نہیں دیکھ سکتیں، اپنے اجاڑپن میں خوش رہتی ہیں۔ بعض زمینیں زود حس ہوتی ہیں کہ بسنے والوں سے طبیعت میل کھا جائے تو ان پر کشادہ ہو کر انھیں نہال کر دیتی ہیں۔ طبیعت میل نہ کھائے تو ان پر تنگ ہوتی چلی جاتی ہیں، مگر یہ آگاہی تو بعد کی بات ہے۔[۲۸]

پاکستان پر بسنے والوں کو اس زمین نے قبول کیا ہو یا نہ کیا ہو، ان مہاجرین کے لیے پرانی یادوں سے پیچھا چھڑانا ممکن نہ تھا اور بالخصوص یہ ہجرت اگر ایک بار سے زیادہ ہوئی ہو تو بستی کا ذاکر ہو یا تذکرہ کا اخلاق، دونوں کا المیہ یکساں تھا۔ دونوں ہی اس نئی بستی میں آشیانے سمیت سکون کی تلاش میں تھے، پھر نئے لوگوں کے ساتھ رہنے کے تجربے نے ان کے اجتماعی شعور کو یک لخت بدل کر رکھ دیا تھا۔ لہٰذا وہ گاہے گاہے ہی سہی یادوں کا مزہ چکھنے کے لیے کسی بھولی بسری یاد کو جھاڑ پونچھ کر سامنے لے آتے تھے اور یہی اجتماعی شعور و تجربہ انتظار حُسین کے اگلے ناول آگے سمندر ہے کا بیانیہ ہے۔ یہ ناول ایک متوازی دھارے میں چلتا ہے۔ غرناطہ سے مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمہ اور ہندوستان سے مسلمانوں کا بحالت مجبوری نکلنا، ناول کے موضوعات ہیں مگر اس میں موجود کردار گویا کراچی کی اَن گنت شخصیات کے خاکے ہیں جن میں سے ایک مجو بھیا بھی ہیں۔ دیگر کرداروں میں کربلائی صاحب، جواد اور مرزا دلاور بیگ بھی ہیں مگر اس ناول میں کرداروں کی بہتات ہونے کے باوجود انتظار حُسین کا یہی وصف ہے کہ وہ اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ اس ہجرت کا موازنہ انھوں نے غرناطہ سے مسلمانوں کی ہجرت کے ضمن میں بھی کیا ہے مگر آزادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہجرت ان سب ہجرتوں پر حاوی ہے اور اسی لیے اس ناول میں پاکستان کا ابتدائی منظر نامہ بھی ہے اور ہندوستان میں رہ جانے والوں کا قصہ بھی موجود ہے۔

کسی معاشرے کی تاریخ میں وہ وقت اندوہ ناک ہوتا ہے جب اس کے افراد سونا سے ٹھیکرا بن جائیں۔ انسان اپنا اصل جوہر کیسے گنواتا ہے، معروضی اعتبار سے اس کا حساب نہیں کیا جا سکتا اور انتظار حُسین کے فن کا نقطۂ عروج اسی

بات کا متقاضی ہے کہ ان کے ناول معروضی کے بجائے موضوعاتی طور پر جامع مطالعے کے ذریعے نئی سرزمین کے باسیوں کے لیے ایک گم شدہ دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آگے سمندر ہے کا مرکزی کردار جواد جب اپنے آباء کی نشانیوں کا حساب کرنے بیٹھتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس کچھ نہیں بچا اور تہی دامن ہونے کا خوف ناول میں بڑے بھیا (مجو بھیا) کے المیے کو بھی جنم دیتا ہے جو یہ بتاتے ہیں کہ کراچی میں بغیر فراڈ کیے رہنا ناممکن ہے۔ ذرا یہ رجحان ساز مکالماتی سطور دیکھیے:

یار مجھے لگتا ہے کہ جیسے ان میں کوئی چیز گم ہو گئی ہو
مجو بھیا ہنسے...
کوئی چیز کی بات کرتے ہو استاد...
یہ تو پورے کے پورے گم ہو گئے ہیں...
ان کی تو کایا کلپ ہو چکی ہے۔ اب یہ...
نہ خالص کراچی والے ہیں۔
اور یہ جو ہمارا لکھنؤ، ہماری دلّی کرتے رہتے ہیں...
سب فراڈ! مگر خیر انھیں معاف کر دو۔ یہ فراڈ ان کی مجبوری ہے۔
مجبوری کیوں ہے؟
اس لیے کہ کراچی میں رہنے کے لیے آدمی کو
کوئی نہ کوئی فراڈ کرنا پڑتا ہے۔

(آگے سمندر ہے: ص۹۰)[۲۸]

انتظار حُسین پاکستانی ناول نگاروں میں موضوعاتی سطح پر اپنی الگ شناخت اس لیے بھی بنانے میں کامیاب ہیں کہ ان کے ناولوں کے کردار، موضوعات اور برتاؤ، نئی سرزمین کے مسائل کو پچھلی روایتوں کی بازیافت کے ساتھ جوڑ کر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے ناول پڑھتے ہوئے ہمیشہ یہ احساس جاگزیں رہتا ہے کہ روایت کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں۔

پاکستانی سماج پر ہجرت، شہری زندگی کے مسائل ابتدائی برسوں میں نمایاں طور پر اپنی چھاپ چھوڑتے نظر آئے مگر بیرونی دنیا کے بدلتے حالات اور خود پاکستان میں حکومتوں کی نااہلی نے کئی ایک ضمنی موضوعات کو بھی پاکستانی ادب کا حصّہ بنایا اور پاکستان میں کئی ایسے ادبی تجربات کیے گئے جو بلاشبہ پاکستانی ادب کا ہی خاصہ کہے جا سکتے ہیں۔

عبداللہ حُسین کے پہلے ناول اُداس نسلیں کو بھی پاکستانی ادب کا پہلا نمائندہ ناول اسی لیے کہا گیا کیوں کہ اس میں زبان، کرداروں کی بنت کے چند ایسے تجربات ہیں جو بہر حال ادبی دنیا میں نئے تھے۔ لہٰذا پاکستانی اُردو ناولوں میں پاکستانی سماجی منظر نامے کی پیش کش ان کے کئی ایک نمائندہ ناولوں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو گی۔ عبداللہ حُسین کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ذاتی تلون مزاجی ان کے ناولوں میں بھی کسی حد تک نظر آتی ہے۔ گو کہ ان کا پہلا ادبی کارنامہ ندی نامی ایک افسانہ تھا جو ۱۹۶۱ء میں سویرا میں شائع ہوا مگر اداس نسلیں موضوع کے اعتبار سے اس دور کے موقر ترین ادبی انعام (آدم جی ایوارڈ) کا حق دار ٹھہرا۔ اس ناول میں وہ سب کچھ ہے جو کسی عظیم شہ پارے کی خاصیت کہلاتا ہے۔ کردار، زبان کا تجربہ، اجتماعیت، تحریکات کا اثر، سیاست، معاشرت اور سب سے بڑھ کر ایک بار پھر ہجرت کے سانحے سے پاکستان کی کل آبادی کی نفسیات کو جوڑنا، اس ناول میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان عبداللہ حُسین کے فن کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

> بیانیہ میں صورت حال کی بھرپور عکاسی کہ افراد کے باطن اور منظر کی دلکشی واضح ہو کر قاری کو گرفت میں کرے عبداللہ حُسین کا مخصوص فن ٹھہرتا ہے۔ مکالموں میں وہ سنجیدہ و فکری مباحث کے ساتھ کرداروں کے جذبات کی خوب صورت پیش کش کرتے ہیں۔ ان کی رواں نثر تاریخ کے بھنور کو زمانی و مکانی خواص کے ساتھ نمایاں کرتی ہے۔[۲۹]

عبداللہ حُسین کے ناول کو پاکستان میں جو پذیرائی ملی اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ متنوع موضوعات کے لیے پاکستانی قارئین کی ذہنی آبیاری ہو چکی تھی۔ عبداللہ حُسین کا تخلیقی سفر یہیں نہیں رکا بلکہ انھوں نے پاکستانی اُردو ناول کی روایت میں جن موضوعات کا اضافہ کیا، ان میں نادار لوگ، باگھ، رات، قید شامل ہیں کیوں کہ ان کا تخلیقی کینوس اس بات کا متقاضی تھا کہ اسے ناول جیسا ہی اظہار میسر آتا اور اسی لیے ان کا ہر ناول ایک تخلیقی تجربہ ہے جس میں سماجی سطح بدلتے رجحانات کو ماضی، حال اور مستقبل کی عینک سے دیکھا گیا۔ ان کے ناولوں میں قدیم تاریخ کو عصری موضوعات سے جوڑ کر دیکھنے کی بھی کوشش کی گئی۔

۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۰ء پاکستانی اُردو ناول نے جو کروٹیں بدلیں، ان میں تہذیبی مسائل کی عکاسی ایک نمایاں حقیقت ہے اور اس ضمن میں شوکت صدیقی، عبداللہ حُسین، قرۃ العین حیدر کے نمائندہ ناولوں کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں مگر موضوعاتی اعتبار سے اسی دور میں اُردو ناول میں چند ایسے تجربات بھی کیے گئے۔ چند ایک مستثنیات کو چھوڑ کر پاکستانی اُردو ناول ان تجربات کو سہارنے کا متحمل نہیں ہو سکا۔ اس ذیل میں جمیلہ ہاشمی، رضیہ فصیح احمد، الطاف فاطمہ کے نمائندہ ناولوں کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں کیوں کہ ان خواتین ناول نگاروں کو ان کے دور میں صرف ناول نگار کی

حیثیت سے ہی جانا گیا مگر ان کے تخلیقی تجربے کی پیروی نہیں کی گئی۔ تلاش بہاراں، دشت سوس، صدیوں کی زنجیر، دستک نہ دو، چلتا مسافر اور ایسے ہی کئی تجربے ان ناول نگاروں کی ذہنی اپچ کا اظہار ہیں مگر افسوس کہ یہ پودا جڑ نہ پکڑ سکا اور یا تو دانستہ طور پر نظر انداز ہو کر رہ گیا یا پھر بعد کے ناول نگار دیگر مسائل کی عکاسی کی طرف نکل گئے۔

عصری تہذیب سے زیادہ کسی گم گشتہ تہذیب کی تلاش میں لکھے گئے اُردو ناول پاکستانی نئی زندگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں مگر ایسے موضوعات پر قلم اٹھانے کی بھی کوئی جرأت چند ایک ناول نگار ہی کر سکے۔ انور سجاد کا ناول خوشیوں کا باغ یا حجاب امتیاز علی کا پاگل خانہ، مستنصر حُسین تارڑ کا بہاؤ ہو یا خس و خاشاک زمانے، یہ سب پاکستانی اُردو ناول کے منفرد زاویے ہیں مگر افسوس یہ روایت کے بجائے محض انفرادی تجربہ بن کر رہ گئے۔

۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء کا دور ناول میں ہجرت کے جذبے، اظہار اور مسائل کی عکاسی کا تھا لہٰذا اس دور میں ہاؤسنگ سوسائٹی، یا خدا اور ایسی بلندی ایسی پستی جیسے ناول سامنے آئے جب کہ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۷۷ء ناول نگاری میں نئے تجربات کی راہیں کھولتا ہے اور اس میں خدا کی بستی، اُداس نسلیں جیسے ناول سامنے آتے ہیں اور فضل احمد کریم فضلی کا ناول خونِ جگر ہونے تک تقسیمِ بنگال، سقوطِ ڈھاکا کا ایک منظر نامہ ہے اس دَور میں تخلیقی دَور ۱۹۷۷ء تا ۲۰۰۰ء کا ہے جس میں تہذیبی بحران کی عکاسی، نئے معاشرے کے مسائل اُجاگر کرتے ناول میں راجہ گدھ، اُداس نسلیں، آنگن جیسے ناول سامنے آئے اور اسی دور میں چند انفرادی تجربے بھی ہوئے جن میں چاکی واڑہ میں وصال، بیس سو گیارہ، خوشیوں کا باغ، پاگل خانہ، العاصفہ شامل ہیں۔ اسی طرح چند انفرادی مگر کامیاب تجربوں کے ساتھ یہ دور پاکستانی ناول نگاری کا زرخیز ترین دور کہلایا جا سکتا ہے کیوں کہ اس میں ناول نگاروں کے پاس فارم، ہیئت اور موضوع سے زیادہ اظہار کا جذبہ پوری شدت سے کار فرما تھا۔ پاکستانی ناول نگاری کے اسی دور میں ملک کے سیاسی و سماجی حالات کی ابتری نے ضرور ایک اہم عنصر کا کردار ادا کیا مگر بالعموم یہ مغربی ادب سے اس استفادے کا بھی نتیجہ تھا کہ اس دَور میں وجودیت، جدیدیت، تانیثت جیسے مباحث بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اُردو ناول میں موجود رہے اور کہیں کہیں تقسیمِ ہند جیسے واقعات کے جلتے بجھتے انگارے بھی ناول میں نظر آتے رہے۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر خالد اشرف، برِصغیر میں اُردو ناول، (اشاعت دوم)، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء)، ص ۳۷

۲۔ ڈاکٹر **ممتاز احمد خان**، اُردو ناول کے ہمہ گیر سرو کار، (**اشاعت اوّل**)، (کراچی: **ماجرا سرائے پبلی کیشنز**، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۵۲

۳۔ **محمد غیاث الدین**، فرقہ واریت اور اُردو ناول، (دہلی: **ایجو کیشنل پبلک ہاؤس**، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۳۰

۴۔ **قرۃ العین حیدر**، میرے بھی صنم خانے، (دہلی: ۱۹۴۹ء)

۵۔ **ایضاً**، ص ۴۲

۶۔ ڈاکٹر **ممتاز احمد خان**، آزادی کے بعد اُردو ناول، (**اشاعت سوم**)، (کراچی: **انجمن ترقی اُردو پاکستان**، ۲۰۱۶ء)، ص ۹۸

۷۔ **غیاث الدین، محمد**، فرقہ واریت اور اُردو ناول، (**اشاعت اوّل**)، (دہلی: **ایجو کیشنل پبلک ہاؤس**، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۱۳۔۱۱۴

۸۔ ڈاکٹر **ممتاز احمد خان**، آزادی کے بعد اردو ناول، ہیئت اسالیب اور رجحانات (کراچی، **فضلی سنز، پرائیوٹ لمیٹیڈ**، ۱۹۹۷) ص ۷۹

۹۔ ڈاکٹر **خالد اشرف**، برِ صغیر میں اُردو ناول، (لاہور: **فکشن ہاؤس**، ۲۰۱۷) ص ۳۰۱

۱۰۔ **حُسین مریم**، شوکت صدیقی کے فکر و فن کا تنقیدی اور تخلیقی جائزہ، **محمد علی قریشی**، (لاہور: **اُردو بازار**، اپریل ۲۰۰۵ء)

۱۱۔ ڈاکٹر **ظفر شہاب اعظمی**، اُردو ناول کے اسالیب، (دہلی: **تخلیق کار پبلشرز**، ۲۰۰۶ء)، ص ۲۲۴

۱۲۔ **محمد غیاث الدین**، فرقہ واریت اور اُردو ناول، (دہلی: **حنیف آفسیٹ پرنٹر**، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۵۴

۱۳۔ ڈاکٹر **محمد عارف**، اُردو ناول اور آزادی کے تصوّرات، (لاہور: **پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی**)، ص ۷۵۱

۱۴۔ **انتظار حُسین**، آگے سمندر ہے، (لاہور: **سنگِ میل پبلی کیشنز**، ۲۰۱۶)، ص، ۳۹

۱۵۔ ڈاکٹر **ممتاز احمد خان**، اردو ناول کے بدلتے تناظر (کراچی: **ویلکم بُک پورٹ پرائیویٹ لمیٹڈ**، ۱۹۹۳ء) ص ۱۳۴

۱۶۔ ڈاکٹر **شاہد نواز**، پاکستانی اُردو ناول میں عصری تاریخ، ۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۷ء، (سر گودھا: **یونیورسٹی آف سر گودھا**، ۲۰۱۸ء)، ص ۲۶۰

۱۷۔ ڈاکٹر **ممتاز احمد خان**، اُردو ناول کے چند اہم زاویے (**افسانوں کے ساتھ**)، (**اشاعت دوم**)، (کراچی: **انجمن ترقّی اُردو پاکستان**، ۲۰۱۶ء)، ص ۲۵۴

۱۸۔ ڈاکٹر **شاہد نواز**، پاکستانی اُردو ناول میں عصری تاریخ، ۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۷ء، (سر گودھا: **شعبہ اُردو یونیورسٹی آف سر گودھا**، ۲۰۱۸ء)، ص ۲۹۰۔۲۹۱

۱۹۔ ڈاکٹر **محمد عارف**، اُردو ناول اور آزادی کے تصوّرات (لاہور: **پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی**)، ص ۹۵۴

۲۰۔ ڈاکٹر **ممتاز احمد خان**، آزادی کے بعد اُردو ناول (**اشاعت سوم**)، (کراچی: **انجمن ترقّی و پاکستان**، ۲۰۱۶ء)، ص ۲۱۷۔۲۱۸

۲۱۔ ڈاکٹر **خالد اشرف**، برِ صغیر میں اُردو ناول (**اشاعت دوم**)، (لاہور: **فکشن ہاؤس**، ۲۰۱۷ء)، ص ۲۹۴

۲۲۔ **قرۃ العین حیدر**، آگ کا دریا (لاہور: **سنگِ میل پبلیکیشنز**، ۲۰۰۰ء)، ص ۲۱۵

۲۳۔ **ایضاً**، ص ۵۴۴

۲۴۔ **قرۃ العین حیدر**، ہاؤسنگ سوسائٹی (لاہور: **سنگِ میل پبلیکیشنز**)، ص ۳۴۲

۲۵۔ **ایضاً**، ص ۲۵۰

۲۶۔ ڈاکٹر **خالد اشرف** ص ۱۴۷

۲۷۔ **وہاب خان شاہد**، اُردو فکشن میں ہجرت (**اشاعتِ اوّل**)، (دہلی: **ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس**، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۸۹۔۱۹۰

۲۸۔ **انتظار حُسین**، آگے سمندر ہے (لاہور: **سنگِ میل پبلیکیشنز**، ۲۰۱۶) ص ۹۰

۲۹۔ ڈاکٹر **ممتاز احمد خان**، آزادی کے بعد اُردو ناول (**اشاعت سوم**)، (کراچی: **انجمن ترقّی اُردو پاکستان**، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۱۳

Abstract

A novel presents a parallel vision of life between us. Some ceremonial novels from world literature have depicted a parallel world and

acclaimed critical response such as War and Peace, Crime and Punishment, Moby Dick and this list is still incomparable and incomplete due to the literary significance the said genre. Urdu novel before independence has created a world of its own and one may notice the lifestyle of urban class with historical references through it while the aftermath of independence and impacts has clearly emerged in Pakistani urdu novel .This article traces out the subject matter , literary movements and experiments of Pakistani Urdu Novelists. It also presents some of the rare -read Novels in which Intezar Hussain's (*Tazkira* تذکرہ) of pivotal specifications due to Pakistan's current scenario. One may notice the paradigm change in literary scene through the classification of era.

Keywords: Pakistani society, Urdu Novels , Literary Experiments, Independence, Political system , Depiction of cities